پروفیسر سعید نفیسی

جدید فارسی ادب

ایران کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جو اپنے ماضی کی ادبی ترقیوں پر بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن اس ملک کا جدید ادب کن راہوں پر گامزن ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے میں ایران کے مشہور عالم، ادیب اور شاعر آقائے سعید نفیسی کے اس مضمون سے بڑی مدد ملے گی۔

ایران کا موجودہ ادب یقیناً اس ملک کے شایانِ شان نہیں ہے جس کی عظیم ادبی روایات آٹھویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتی ہوں اور جس نے دنیا کی تہذیب میں سیکڑوں اہم شخصیتوں کے ناموں کا اضافہ کیا ہو۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر تک فارسی ادب اپنی پوری بلندیوں تک پہنچ گیا تھا ـــــ عربی ادب پر ایرانی اثرات سے قطع نظر ترکی ادب اور اردو ادب کافی حد تک فارسی سے متاثر ہوئے تھے۔

فارسی شاعری بتدریج حقیقت نگاری، فطرت نگاری، اشاریت اور تاثر نگاری کے تمام مدارج سے گزری ہے۔ ان میں تاثر نگاری ۱۵ویں صدی کے آخری ربع سے شروع ہوتی ہے۔

نثری ادب میں تاریخ، بیانیے (حکایات) اور عوامی قصے جنہیں کلاسکی مصنفین نے بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ کافی تعداد میں لکھے گئے اور شعری ادب میں ایرانیوں کو رزمیہ، بیانیہ اور تمثیلیہ شاعری کا ایک قابل قدر ورثہ ملا۔

پھر انیسویں صدی کے شروع ہی سے ایرانی ادب زوال پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ یورپی ادب کی نقالی میں کلاسکی اصناف پر پردہ سا پڑنے لگتا ہے۔ اور خود یورپ کی نقالی بھی ابھی تک وہ متوقع نتیجہ برآمد نہ کر سکی جس کی ایک قدیم ادبی روایات کی مالک فنکار قوم سے امید کی جاتی تھی۔

موجودہ فارسی زبان میں فرانسیسی انگریزی جرمن اور روسی زبانوں کی تمام اہم ادبی شائع شدہ کتابوں کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ اطالوی، اسپینی اور اسکینڈینیوی ادب عالیہ کا بھی کچھ حصہ فارسی میں منتقل ہو گیا ہے۔ ترجمہ کا کام جاری ہے اور خصوصیت سے پچھلے دو سالوں میں ایک انجمن بنگاہ تالیف و ترجمہ نے حکومت کی زیر نگرانی اطالوی اور یونانی کتابوں کے ترجمہ اور اشاعت کا ایک وسیع پروگرام ترتیب دیا ہے جس پر عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ اور تقریباً ایک درجن ہومر، سافوکلس، شکسپیر، گوئٹے، بالزاک، ترگنیف اور اندرے گائڈ کی کتابیں فارسی داں طبقہ تک پہنچا دی گئی ہیں۔

یورپی ادب کے ترجمہ کا کام انیسویں صدی کے اوائل سے شروع کیا گیا۔ یورپی زبانوں میں فرانسیسی ایران میں تقریباً ایک

صدی پہلے سے ملک گیر اثر کی مالک ہے۔ اسی لئے سب سے پہلے فرانسیسی ادب ہی ایرانیوں کے سامنے آیا۔ یورپ کی دوسری زبانوں کی کتابیں بھی فرانسیسی ہی کے ذریعے اشاعت پذیر ہوئیں۔ والٹیر سب سے پہلا یورپی مصنف ہے جس کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا اس کے بعد الیگزینڈر ڈوما کے تقریباً تمام ناول ترجمہ ہوئے۔ ان تراجم میں خاصی بڑی تعداد سہاتی اور جاسوسی ناولوں کی رہی۔

گذشتہ بیس سال میں انگریزی اور روسی کتابوں کے کافی ترجمہ ہوئے کچھ امریکی مصنفین کی تصنیفات بھی اسی دوران میں ترجمہ کی گئیں۔ اسی طرح رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی انگریزی کے ذریعہ فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

اس کے علاوہ جدید مصری ادب بھی ایران میں متعارف ہوا۔ مشہور عربی رسالہ الہلال کے بانی عیسائی عرب مؤرخ جرجی زیدان نے بھی ایرانی ادب کو بہت متاثر کیا۔

کلاسکی روسی ادب کے اثرات بھی کچھ کم نہیں رہے ــــــ پشکن، لرمانٹوف، گوگول، داستووسکی، ترگنیف اور ٹالسٹائی کی تمام کتابوں کے ترجمے کئے جا چکے ہیں۔ میکسم گورکی کی تصانیف بڑی مقبول ہیں۔

جہاں تک جدید ادب کا تعلق ہے۔ انیسویں صدی مکمل طور پر ترجمہ کا عہد ہے۔ اس صدی کے اواخر میں مولیر کے ترجموں سے جدید ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے ــــــ اب بھی تہران کے تھیٹروں میں مترجم یا ماخوذ چیزیں ہی پیش کی جاتی ہیں۔

یورپی ادب کے ابتدائی اثرات قومی شاعری کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ خصوصیت سے ۱۹۰۶ء کی آئینی تحریک کے دوران پہلی کوششیں جنگ بوئرا اور ۱۹۰۴ء کی روسی جنگ کے زمانے میں ظہور پزیر ہوئیں۔ ان دونوں جنگوں کی صدائے بازگشت پورے ایشیا میں گونجی خصوصیت سے ایران میں یورپی اقوام کی ہوس ملک گیری کے خلاف عوامی جدوجہد کا ہر طرف خیر مقدم کیا جانے لگا۔ اس قومی تحریک میں دو کمزوریاں تھیں۔ ایک تو شدید قنوطیت اور دوسری اپنے خول میں ٹھہرا رہنا۔

ابتدائی ناول جو بیسویں صدی کے آغاز میں شائع ہوئے اسی شدید قومی عصبیت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور مجموعی حیثیت سے زوال آمادہ ہیں۔ ترجموں کی اس تحریک میں باقاعدگی اور مرتب پروگرام کی کمی پائی جاتی ہے۔ سارے کے سارے ترجمے "فی البدیہہ" کام کے ہیں اکثر پہلے درجہ کی تصنیفات کو دوسرے درجہ کی کتابوں کے مقابلے میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اطالوی اور یونانی کتابوں کے ترجمہ دیر سے ایرانیوں تک پہنچے۔ اب کسی حد تک اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

موجودہ صدی کے اوائل سے ادب کے تمام اصناف ناول مختصر افسانے مضامین کہانیاں اور ڈرامے خصوصیت سے ذریعہ ڈراموں وغیرہ کا احاطہ کر لیا گیا اس سب کے باوجود ہم ابھی تک عالمی ادب عالیہ کے بہت سے شاہکاروں تک ذاتی نہ ہو سکے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔

عظیم ادبی روایات جو آنے والی صلاحیتوں کو اپنی تیز روشنی سے مجروح کر دیتی ہیں، اس یک رنگی کی ذمہ دار ہیں۔ ایک طویل ادبی دور اس روشن ماضی کے بارگراں سے دبا رہتا ہے یہاں تک کہ کچھ غیر معمولی ذہن اس طلسم کو توڑ دیتے ہیں۔ اور اظہار خیال کی نئی راہیں دریافت کرتے ہیں۔ ایرانی ادب اب بھی اس مسئلہ سے دوچار ہے صدیوں سے لٹریچر ماضی کے سائے میں پلتا رہا ہے۔ فن کار کے لئے ہمیشہ ان خطوط کی پیروی ضروری قرار دی جاتی رہی ہے۔ جو متقدمین نے قائم کئے تھے۔ وہ اپنی تصنیفات میں رائج الوقت سماجی پسندیدگی کا پابند رہا۔ اس کی اپنی شخصیت کی عکاسی اس کی تخلیقات میں نایاب تھی۔ اسے ٹکے بندھے اخلاقی اصولوں کی پابندی لازمی تھی۔ اور اسے اپنے ان پڑھنے والوں کے ذوق اور مطالبات کا بھی خیال رکھنا تھا جو حکمران طبقہ سے یا اونچے علمی حلقوں سے متعلق تھے۔

عوامی ناول مختلف دوروں میں اور کافی تعداد میں گمنام مصنفوں کے قلم سے نکلتے رہے لیکن انہیں علمی طبقہ نے ادب پارے کی حیثیت سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ کتب فروشوں تک نے انہیں بیگانہ ادب کے نام سے شہرت دی۔ چھاپہ کی ایجاد کے بعد تو ان کا شمار قطعی ناپسندیدہ تخلیقات میں ہونے لگا۔ اور ان کی خرید و فروخت بھی بس معمولی تاجروں کے ہاتھوں ہی میں رہی۔ بورژوا نظام میں فنکار مشاہدہ پر تخیل کو ترجیح دیتا رہا ہے۔ دسویں اور گیارہویں صدی کے درمیانی عرصہ میں جو فارسی ادب کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے، شاعری بڑی حد تک حقائق سے ہمکنار تھی۔ بعد میں صوفی شعرا نے بھی جو اچھے فنکار اور معلم اخلاق تھے تمثیلی انداز بیان اختیار کیا۔ فارسی شاعری اسی وجہ سے دوسری اصناف کے مقابلے میں سبق آموز حکایات سے بھری پڑی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ صوفی شعراء ہی تھے جن کا براہ راست عوام سے رابطہ اور تعلق رہا۔ بڑی بڑی نام نہاد ادبی شخصیتیں الگ تھلگ محلات کی چار دیواری میں مقفل رہیں یا ایسی گوشہ نشین ہوئیں کہ ان تک پہنچ ناممکن ہو گئی۔

غنائی شعرا نے اکثر و بیشتر فرسودہ اور روایتی عشق اور ماورائی جمالیات کا تصور پیش کیا۔ شراب تک کو جس کی ایرانی شاعروں نے خوب خوب قصیدہ خوانی کی ہے اشاراتی معنی پہنائے گئے۔ محبوب کا پیکر غیر جسمانی عالم بالا کی صفات کا حامل بن گیا۔ شاعر کی اپنی حیثیت عندلیب زار کی ہو گئی۔ جو پھول کھلنے کے انتظار میں اضطراب کی گھڑیاں بتا رہا ہے۔ شمع کے بجھنے پر پروانہ مرثیہ خواں نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی ماورائی عشق کی دلالت کرتے ہیں۔ اور اسی نے اتنی بڑی مقدار میں اشاراتی شاعری کو جنم دیا۔

اس طرح بڑے سے بڑے فنکار ان قدیم روایات کے تنگ و تاریک گھروندوں ہی میں محصور ہو کر رہ گئے۔ صرف رزمیہ شاعری ہی تھی جس نے آزادی تخیل کا ایک وسیع میدان تیار کیا جس میں قومی ولولوں اور آرزوؤں کی تگ و تاز کے لئے کافی گنجائش تھی ـــــ وہ ولولے جو زمانہ کی رفتار اور حوادث کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں پرورش پاتے رہے۔

موجودہ ادیب بھی صدیوں پرانے اس مسئلہ سے دوچار ہیں۔ ان کے لئے روایت کے بندھنوں سے آزاد ہو جانا جو قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں، بڑا مشکل ہے۔ آج کے مقبول فارسی نثر نگار وہ ہیں جو معاشرتی خرابیاں ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ

اس سماج میں بسنے والوں کی آرزوہائے نایافت کو پانے کی کوشش میں بھی لگے رہتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک لیس اسی پر قانع ہو گئے ہیں کہ جیمس موریر کے قصے "حاجی بابا اصفہانی" کی نقالی کرتے رہیں جسے یقیناً اپنے زمانہ میں حقیقت نگاری کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے لیکن تعجب ہے کہ آج بھی اس کی مبالغہ آمیز حاشیہ آرائی کو بہت سے ادیب نمونہ بنائے ہوئے ہیں۔ کچھ دوسرے لکھنے والے ایسے مہاتی پلاٹ کی ایجاد میں لگے رہتے ہیں جو صرف ان کی طفلانہ تخئیلی اڑان کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ عصبیتیں ابھاری جاتی ہیں۔ انہیں صیقل کیا جاتا ہے اور پھر ان پر تبصرہ کیا جاتا ہے اور اس طرح چوکھٹے میں جڑی ہوئی ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جس کے کینوس میں تناسب کی کمی اور مضحکہ خیز حد تک بدسلیقگی ملتی ہے۔ ان میں سے کچھ خود ساختہ دنیا میں حقیقت پسندی کی جستجو کرتے ہیں جو محض ان کے تخئیل کی پیداوار ہوتی ہے اور اسی لئے اس میں غنائیت کا فقدان ہے۔ جو تمام آفاقی اور ابدی ادبیات عالیہ کی بنیاد ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ادیب اپنے پڑھنے والوں کی زندگی کے قریب نہیں آتا۔ وہ مشاہدہ سے کام نہیں لیتا۔ گنتی کے کچھ لکھنے والوں نے فطرت کو اپنا موضوع بنایا مگر وہ بھی صرف خارجی بیان کی حد تک ——— اور اس دوری کی وجہ یہ ہے کہ سماجی طبقات ابھی تک ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں ان میں وہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ہے۔ جو کبھی عوام کے حالات کا مطالعہ نہیں کرتا۔ اور اپنے ماحول سے قطعاً ناواقف ہوتا ہے۔ یہ لوگ کبھی بھی اپنے آپ کو اس بڑے عوامی حلقہ کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے جن کی توجہ کو ان کی تخلیقات اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں۔ ان کے پڑھنے والے اونچے طبقہ کے افراد ہیں۔ اور ان میں سے بھی بہت تھوڑے ایسے ہیں۔ جو کسی یورپی زبان میں پڑھنے کے مقابلے میں فارسی زبان میں پڑھنے کو ترجیح دیں۔

اشاعتیں محدود ہوتی ہیں ایک ہزار کا ایک کتاب کا ایڈیشن مہینوں بازار میں پڑا رہتا ہے اور ایسی کتابیں تو بہت ہی کم ہیں جن کے ایک سے زیادہ ایڈیشن نکل سکے ہوں۔

کچھ مخصوص ادیب بھی جو قدیم ادبی روایات میں نیا پن پیدا کرنا چاہتے ہیں سبک اور دلآویز طریقہ اظہار کی جگہ پر زور انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔ ان کی باتیں کھوکلی ہوتی ہیں۔ وہ تخلیقی قوتوں سے کچھ کام نہیں لیتے۔ ایسے مصنفین اپنے آپ کو اس عمومی گروہ سے علیحدہ نہیں کر پائے جو صدیوں سے اخلاقیات کے علمبرداروں کی شکل میں انہیں باتوں کو دہراتا رہا ہے۔

بچوں کے ادب کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایرانی ادیب اپنے سال خوردہ پڑھنے والوں کو بھی بالکل بچہ سمجھتے ہیں۔

یورپی ادبی نمونوں کا انتخاب بھی ہمیشہ مفید نہیں رہا۔ ایک زمانے میں ریمارک کی جنگی رپورتاژ "مغربی محاذ ——— مکمل سکون میں" کو بڑی بدسلیقگی سے استعمال کیا گیا اور کئی دوسرے ادیب ٹامس مین، جیک لندن، ایڈگر ایلن پو اور کچھ ان کے علاوہ دوسرے درجہ کے مصنفین کی تقلید میں لگے رہے۔ ہمارے بہت سے ادیب رپورتاژ اور تخلیقی فن پارے کے فرق کو بھی نہیں سمجھتے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ایک صحافی ایک ادیب سے کس حد تک مختلف ہے۔ ایک نوجوان ادیب جس کا مطالعہ معمولی سا ہے اپنی ہر سطر میں خود نمائی کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ اس کے یہاں سارا زور اظہار ذات پر ہے۔ وہ اپنے پچیس تیس مختصر افسانوں

کا خود ہی ہیرو ہے۔ اور اس کی تحریروں کا تمام تر ماحول ایران سے زیادہ یورپ اور امریکہ کی زندگی کا عکس پیش کرتا ہے۔ ایک اور ادیب کا موضوع شادی شدہ عورتوں کی بدکاری ہے۔ اور وہ اسی ایک موضوع پر بے تکان ایک ہی انداز میں لکھتا رہتا ہے۔ اس کے نتائج اخذ کرنے اور موضوع کے تانے بانے تیار کرنے میں کوئی جدت نہیں ہوتی۔

میرے ملک کے نئے ادب میں تنقید کا فقدان ہے۔ تنقید کو دشمنی بغض اور عناد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کوئی نقاد اصولِ زبان اور قواعد کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کرنے کا مجاز بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص معاصرین کے انتخاب کا ارادہ کرے۔ تو یہ اس کے لئے ایک دردِ سر سے کم نہیں ہوتا اور اس کام سے عہدہ برآ ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے ——— یا تو وہ ہر چیز کو شامل کرے یا سب کو نظر انداز کر دے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہر ادیب اپنی ہر تخلیق کو ایک مکمل ادبی کارنامہ سمجھتا ہے۔ جس کا انتخاب بھی ہو سکتا ہے یہ اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ اور وہ اسے بداندیشی اور بدخواہی کے مترادف سمجھتا ہے اس سب کے باوجود ایرانی ادیب کو ذاتی طور پر موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک گڈمڈ سماج میں بسنے والے اس وقت تک کوئی شاہکار تخلیق نہیں کر سکتے جب تک وہ خود مکمل طور پر عملی اور باہمت نہ ہوں اور ایک مشترک منزل کی تلاش میں مشترک نظریات کے سہارے قدم نہ بڑھائیں۔ آج کل ایرانی عوام کے ذہنوں پر گہرے جمود کا سایہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی مجہول کیفیت کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور انہیں خوب جھنجھوڑا گیا ——— اسے ابھی زیادہ دن بھی نہیں ہوئے پھر بھی وہ سب کچھ انہیں خوابِ گراں سے بیدار کرنے کے لئے ناکافی تھا۔ اور اس قسم کی ساری تحریکیں بالکل شروع ہی میں دبا دی گئیں۔

قدرتی طور پر فنکار کی وہ حوصلہ افزائی نہیں ہوتی جس کے لئے ہر فنکار پیاسا ہوتا ہے۔ اس کا میدانِ عمل محدود ہوتا ہے۔ وہ خود ہوتا ہے اور بہت تھوڑے سے ہمنوا اسی ۔۔۔ سب کچھ اپنے تخیل کی دنیا میں تلاش کرنا پڑتا ہے پھر کلاسیکی ادب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جو اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک بہتر پناہ گاہ ہے اور جس کا آسرا لینے پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوتا۔

تاہم جدید فارسی ادب میں ایسے شاہکار ادب پارے بھی ہیں جن کی شہرت بیرونی دنیا تک پہنچ گئی ہے اور ایران سے باہر ان کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی ہے۔ معاصر ناول نویس اور افسانہ نگاروں میں صادق ہدایت کا شمار اب بھی صفِ اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ چار برس ہوئے جب ایک حادثہ نے اسے ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا مختصر افسانوں کے پانچ مجموعے دو ناول چند تراجم اور کچھ علمی تصانیف وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے اس کے یہاں اسلوب ادا میں کوئی خاص توجہ نہیں ملتی اور بسا اوقات وہ کلاسیکی اندازِ بیان سے جو ایرانیوں کا مزاج بن چکا ہے دور جا پڑتا ہے۔ ممکن اس کا سبب وقت کی کمی ہو یا پھر ممکن ہے اتنی زحمت گوارا نہ کی گئی ہو کہ اپنے لکھے پر نظرِ ثانی کی جائے اور نوک پلک سے درست سلیقہ کی ترتیب سامنے آئے ——— اس کے بہت سے فارسی جملوں میں جو دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر اپنا عیب چھپا لے جاتے ہیں، کافی جھول ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ معمولی چیزیں آسانی سے نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔ کوئی پڑھنے والا بھی اس کے جذبہ کی شکست اور بے بس کر دینے والی کیفیت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا

جس میں قدم قدم پر زہر ناکی ہر چیز پر شبہ کی نظر اور والٹیر جیسا انداز ملتا ہے۔ جس میں ایک قنوطیت پسند ناانصافی اور نابرابری کے تمام پہلوؤں کا ایک بڑے فنکار کی حیثیت سے مشاہدہ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے چند افسانوی کا شمار تو کلاسیکی ادب میں ہونے لگا ہے اور ایرانی اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے ایک ناول 'بوفِ کور' کا فرانسیسی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

اتنا اندازہ بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ الفاظ اس کے امنڈتے ہوئے جذبہ کی ترجمانی پر پوری طرح قادر نہیں ———— وہ جذبہ جو عام سطح سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں جملے کے جملے اُلجھے ہوئے اور مبہم ہوتے ہیں۔ صادق غیر معمولی طور پر حساس ہے۔ اگر کوئی ڈاکٹر تشخیص کرتا تو اسے شدید جذباتیت کا مریض قرار دیتا اس کے نکھرے ہوئے جمالیاتی ذوق کا یہی سلیب ہے۔ اس نے کبھی بھی پست بھدی، عام اور روایتی چیزوں کو برداشت نہیں کیا۔

صادق ہدایت کے بعد محمد علی جمال زادہ کا نمبر آتا ہے۔ جو صادق کے بعد ایران میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک شاہکار "مجموعہ حکایات" سے کیا۔ جو شائع ہوتے ہی کلاسیکی مرتبہ کا مالک ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی چھ کتابیں اور نکلیں۔ مگر انہیں وہ بات نصیب نہ ہو سکی۔ ایران کے باہر مقیم یہ عظیم ادیب اس سماج کا بڑا اچھا مصوّر ہے جس سے تقریباً چالیس سال پہلے اس کا واسطہ رہ چکا ہے۔ خود وہ نسل جس میں وہ اچھی طرح متعارف تھا مسلسل ختم ہوتی جا رہی ہے اور نئی نسل جو موجودہ ادب پر قابض ہے۔ اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے رسوم و رواج کے بیانات میں کچھ وہی لوگ لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جو ابھی تک اس زمانے کو نہیں بھولے جسے وہ جمال زادہ کے عہد میں دیکھ چکے ہیں۔ اس کی زبان روزمرہ پر مشتمل محاوروں ضرب الامثال اور تمثیلات سے پُر ہوتی ہے جنہیں وہ اپنی یادوں کے خزانے سے نکال نکال بڑی چابکدستی سے پیش کرتا ہے۔

بزرگ علوی بھی آج کل ایران سے باہر ہی مقیم ہے۔ اس کے مختصر افسانوں کے تین مجموعے اور دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ بزرگ کو آسانی سے پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے یہاں حقیقت نگاری بھی ہے تو معتدل قسم کی۔ کبھی کبھی تو وہ تفصیل پسندوں کو کافی مایوس کر دیتا ہے۔

ناول نگار میر محمد حجازی کی زبان دوسروں سے زیادہ قدیم رنگ سے متاثر ہے اور وہ خود قدامت پسند لوز ژوا ماحول سے نہیں نکل سکا ہے۔ جس میں عام سہل الحصول روایتی نتائج کی تبلیغ نے جس کا کوئی اور چھور بھی نہیں اس کی حقیقت نگاری کو کچھ مبہم بنا رکھا ہے۔

دو اور ادیب جن کا ابھی کچھ برس پہلے انتقال ہو گیا، کچھ ایسی تحریریں چھوڑ گئے ہیں جن کی اٹھان بڑی اچھی تھی۔ مقتول صحافی محمد مسعود نے رسوم و معاشرت کے دلچسپ تجزیہ کے لئے "تلاشِ معاش" لکھی لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے اپنے اخبار میں عوام کو ابھارنے کے لئے جو کچھ لکھتا تھا وہ سب کچھ ایک مصنف کی حیثیت سے اس کے لئے کافی مضرت رساں تھا۔ جواں مرگ جہانگیر جلیلی جو اپنی ادبی زندگی کے آغاز پر ہی دق کا شکار ہو گیا۔ ہمارے لئے معاصر نثر کا ایک عظیم شاہ

چھوڑ گیا ہے ـــــ "من ہم گریہ کردم" ـــــ اس کتاب کا غمناک اسلوب اور مواد بڑی حد تک بے داغ ہے۔ اور زندگی کی روا روی میں ایک افسردہ غنائیت اس کے صفحات میں بکھری ہوئی ہے۔

ایک اور بڑی اچھی اٹھان کا ادیب اعتماد زادہ ہے جس کی "دختر رعیت" اس جدلی حقیقت نگاری کی تمام خصوصیات کی حامل ہے جس کے ذریعہ اس طبقہ کے مصائب آسانی سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جو ایران کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے اور پھر بھی مظلوم ہے۔

صادق چوبک کے مختصر افسانوں کے دو مجموعے نکل چکے ہیں۔ اس کی بعض تحریریں بڑی مؤثر حقیقت نگاری کا نمونہ ہیں ویسے اس کے اظہار بیان کی آزادہ روی پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر عہد کے پڑھنے والوں کے لئے موزوں نہیں۔ ایک اور ادیب جو کلاسیکی اسلوب اور موضوعات کو دوسروں کی بہ نسبت اپنانے کی زیادہ کوشش کرتا ہے ڈاکٹر شیراز پور ہے جو آج کل دہلی میں ہے۔ کسی زمانے کے سیاست دان اور صحافی علی دشتی کا شمار ان ادیبوں میں ہے جو حکمران طبقے اور اونچے بورژوا حلقوں میں مقبول ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ کبھی بھی اپنے تار عنکبوت سے باہر نہ نکل سکا۔ اور شاید اسی لئے وہ اس طبقہ پر کوئی کڑی تنقید بھی نہیں کرنا چاہتا جس میں وہ رہتا بستا ہے۔

اس ادبی حلقے کے علاوہ کچھ اور لکھنے والے بھی ہیں، جو دلچسپ خیالی اور تصوراتی چیزیں لکھتے رہتے ہیں۔ یہ مواد ان مصور ہفتہ وار رسالوں کے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے ہوتا ہے جن کی تعداد ایران میں سب سے زیادہ ہے ان کے لئے موزوں ترین نام حادثات سے بھرپور تحریریں ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ مہمتیں بناتے ہیں اور بلا مقصد کی خونخوار محبتیں دکھلاتے ہیں ـــــ جبکہ ایرانی ادب کی کلاسیکی روایت کا مزاج سادہ اور پاکیزہ محبت کا رہا ہے۔

آخر میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ نئے لکھنے والے حقیقت نگاری کی طرف ہی مائل ہیں۔ مگر بدقسمتی سے کبھی کبھی اس پر بھی شاعرانہ مبالغہ کی چھاپ پڑ جاتی ہے۔ جو جامعیت اختصار اور صحت بیان سب کو مجروح کر دیتی ہے اور جن کی آج کے سارے پڑھنے والوں کو تلاش ہے کیونکہ زندگی پہلے کہیں زیادہ مصروف ہوتی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سینما نے بھی ادب کی کافی رہنمائی کی ہے۔

کلاسیکی فارسی ادب کا پیش بہا سرمایہ موجودہ شاعروں کے لئے ابھی تک ایک ناقابل عبور دیوار بنا ہوا ہے ـــــ ـــــ اور جنہوں نے ان زنجیروں کو توڑنا چاہا۔ انہیں ایک عام بیزاری کا سامنا کرنا پڑا جس میں بلا کی شدت تھی۔ ایک عظیم شعری ورثہ کی مالک قوم کی طرف سے اس کا اظہار آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے بعض شاعروں کا کہنا ہے کہ وزن اور قافیہ کی پابندیاں جو عرصہ سے مسلط ہیں فنکار کو اس آزادی اظہار کا موقع نہیں دیتیں جس کا موجودہ زمانہ متقاضی ہے۔ انہوں نے نظم معریٰ اور شعر ہجائی کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ جس کی حیثیت شاعرانہ نثر کی سی ہے جس میں وزن اور ترنم دونوں غائب ہو سکتے ہیں۔ ان شاعروں میں سے بہتوں کو بدنام و رسوا کیا گیا اور وطن دشمنی کا

الزام تراشا گیا۔

اس طرح پڑھے لکھوں کی بڑی اکثریت قدیم اسالیب میں گھری رہی۔ اور جب کبھی انہیں نئے خیالات کے اظہار کی ضرورت پڑی تو اپنے پیشروؤں کی تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا لیا۔ حالانکہ نئے زمانے کی مادی اور اخلاقی قدروں اور رسوم و رواج کے سامنے ان کی قیمت گرتی جا رہی ہے۔

ایران میں جدید شاعری کا ایک دلچسپ پہلو نوجوان خواتین کا اس میں حصہ لینا ہے۔ کلاسیکی فارسی شاعری میں خواتین کا خاص حصہ رہا۔ اور ایران اس پر ناز کر سکتا ہے کہ اس نے دنیا کو خاتون شاعروں کی سب سے بڑی تعداد دی ہے۔ دسویں صدی کے بڑے شاعروں میں ایک ذہین عورت بھی شامل ہے جس نے اپنے فن پر اپنی زندگی کو قربان کر دیا اور بڑے دردناک حالات میں جان دی۔ آج کل بہت سی نوجوان خواتین چھوٹے چھوٹے شعری شاہکار پیش کرتی رہتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت فروغ فرخ زاد کی ہے جسے اظہار بیان کی آزادیوں پر تنقید کا ہدف بنالیا گیا ہے۔ اور جو ایسے ملک میں واقعی انقلاب کا حکم رکھتی ہے۔ جہاں اب سے ۲۰ سال پہلے عورت کی سوسائٹی میں کوئی جگہ نہ تھی۔

فروغ کی شاعری ـــــــ مجھے فروغ کو اس کے نام کے پہلے حصہ سے پکارنے کی عادت ہے ـــــــ میں لا ثانی صفائی، غنائیت، جذباتیت اور گمبھیرپن ہے۔ جب میں نے اس کے نکتہ چینیوں کے خلاف قلم اٹھایا اور اس پر ایک مقالہ لکھا تو میں نے کہا تھا کہ صدیوں تک مرد عورتوں کے لئے اپنے جذبات کو پرورش کرتے رہے اور عورتوں نے بے چون و چرا انہیں سنا۔ اب شاید وہ وقت آگیا ہے جب عورتیں بتائیں کہ وہ کیا محسوس کرتی ہیں اور ہم مردوں کے لئے یہ زیادہ معقول ہوگا کہ ہم سلیقہ سے سنیں کہ انہیں ہم سے اور ہماری بابت کیا کچھ کہنا ہے۔

فروغ وزن اور قافیہ کی قدیم پابندیوں کا احترام کرتی ہے۔ اس کی بدعت صرف قافیوں کی ترتیب میں تبدیلی نئے آہنگوں کی تلاش اور وزن کی تقسیم ہے۔ نتیجہ میں اس کے یہاں ایسے نمونے ملیں گے جو دوسروں کی ہمت افزائی کر سکتے ہیں اس کی مثال دوسرے نوجوان شعرا نے بھی لی ہے۔ جنہیں کافی دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ان میں مسعود فرزاد، نیما یوشیج، پرویز ناتل خانلری، پیژمان بختیاری، نادر نادرپور، ابتہاج سایہ، احمد شاملو، فریدوں توللی، فریدوں مشیری، سیاوش کسرائی، محمد زہری، خلیل آسا کشتی، فریدوں کار اور گلچیں میرفخرائی مقیم انگلستان قابل ذکر ہیں۔

نوجوان شاعرات میں وہ جو کلاسیکی اصولوں کے تحت شاعری کرتی ہیں۔ اور جن کی نظموں میں بڑی جان ہوتی ہے سیمیں بہبہانی، پروین دولت آبادی، پروین بامداد، مستوفی الملکی، لعبہ شہبانی اور ژالہ قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے اونچی جگہ ذہین فنکار پروین اعتصامی کی ہے۔ جسے عین جوانی میں موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا جس کا کلام اپنے شدید انسان دوست احساس اور مادرانہ خلش و اضطراب کے سبب چھپنے کے ساتھ ہی کلاسک بن گیا۔

نئی نسل کی لکھنے والیوں نے ابھی ناول اور مختصر افسانہ کی طرف توجہ نہیں کی ہے شاید اس کا یہ سبب ہو کر عورتیں صدیوں

سے سماجی زندگی سے بالکل بے تعلق رہی ہیں اور اب کوئی بیس سال سے اپنے حقوق حاصل کر سکی ہیں۔

ویسے ابدیت پسند لکھنے والوں میں کلاسیکی شاعری کی تقلید عام ہے عظیم شاعر بہار جو ابھی چار سال پہلے ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا، کافی مشہور ہے اور شہرت کا مستحق بھی ہے اس کے دبستان کے ممتاز فنکاروں میں شہریار (جنے اپنے شاندار آغاز کے باوجود ادھر کئی سال سے بہت کم کہا ہے) راوی ازرخشی، یوک رہی معیری، مہدی حمیدی، ادیب ہرومند، محمود فرخ، موید ثابتی، احمد گلچیں معانی، احمد سہیلی، حبیب لغمانی، صادق سرمد، صہبا، غلام رضا روحانی، ابوالقاسم حالت محمد علی عبرت، محمد علی تاسبع، ابوالحسن ورذی ہیں۔ کوئی شخص جدید شاعری کا ذکر کرتے وقت ان چند شاعروں کو نظر انداز نہیں کر سکتا جن کا ابھی کچھ سال پہلے انتقال ہوا ہے اور جنہوں نے اپنے زمانے کو بعض ایسی نئی چیزیں دیں جو بہت عرصہ تک عوام میں مقبول رہیں۔ اسی لئے عارف قزوینی، نوجوان مقتول شاعر میرزادہ عشقی اور امیرج مرزا باوجود اپنی قدامت افکار کے ابھی تک عام طور سے پسند کئے جاتے ہیں۔ جہاں تک بچوں کے ادب کا تعلق ہے ایران اس میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ کہانیوں کے مجموعے تمثیلی نظمیں اور بہت سی حکایات بچوں کے لئے لکھی گئیں۔ لیکن جدید تقاضوں کے مطابق ہمارے نئے ادیبوں نے مشکل ہی سے کوئی چیز پیش کی ہے۔ صرف صبحی مہتدی کا ایک مجموعہ ایسا ہے جس میں بچوں کے مقصد کی تقریباً ساری ہی عوامی کہانیاں جو عوامی قصہ گویوں کے سینوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ جمع کر دی گئی ہیں البتہ اس کے مجموعے لوک کہانیوں کے لحاظ سے بھی بہت دلچسپ ہیں۔

تاریخ جمہوریت

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

قبائلی معاشروں اور یونان قدیم سے لے کر عہد انقلاب اور دورِ حاضرہ تک جمہوریت کی نوعیت و ارتقاء، مطلق العنانی اور جمہوریت کی طویل کش مکش، مختلف زمانوں کے جمہوری نظامات اور اسلامی و مغربی جمہوری افکار کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے

قیمت آٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ ۲ کلب روڈ۔ لاہور